© rasailojaraid.com

جدید الیکٹرانک میڈیا کے بارے میں حالیہ بحث ومناظرہ

مولانا محمد زاہد (نائب مہتمم: جامعہ اسلامیہ امدادیہ، فیصل آباد)

شعبان کے مہینے میں جامعہ فاروقیہ کراچی میں ملک کے کچھ اہل علم وافتاء کا ایک اجلاس شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہم کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں مروجہ اسلامی بینکنگ اور میڈیا بالخصوص الیکٹرانک میڈیا کے مناظر کی حرمت کا فتویٰ جاری ہوا۔ ہمارا خیال نہیں تھا کہ ان مسائل کو ان صفحات میں زیر بحث لایا جائے اور نہ ہی اس طرح کے فروعی اور مختلف فیہ مسائل پر ان صفحات میں بات کی جاتی ہے لیکن فتویٰ جاری ہونے کے بعد میڈیا کے ذریعے بڑے پیمانے پر اس کی تشہیر ہوئی۔ بعض اخبارات نے اسے نمایاں طور پر شائع کیا اور کئی ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ بعض ٹی وی چینلز نے بھی اسے کافی اچھالا اور شاید فریقین کی ٹی وی پر بحث کرائی ہے۔ اس کے بعد پچھلے دو مہینوں میں دیکھنے میں آیا کہ دینی جرائد ورسائل میں بھی اس پر بحث چل نکلی ہے اور بعض جگہوں پر ان دونوں مسئلوں پر حدود اعتدال سے تجاوز ہو رہا ہے۔ اس لیے دونوں معاملات میں نفس مسئلہ پر اپنی رائے عرض کرنے کا تو اب بھی ارادہ نہیں ہے اور نہ ہی ہماری یہ حیثیت ہے کہ ہم بڑے بڑے علماء اور فقہاء کے درمیان محاکمہ کریں۔ البتہ مناسب معلوم ہوا کہ کچھ عمومی اور اصولی باتیں عرض کر دی جائیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جن حضرات علماء کرام مدظلہم کے دستخطوں سے یہ فتویٰ جاری ہوا ہے ان کی رائے سے علمی طور پر کسی کو اتفاق ہو یا اختلاف، بطور ایک علمی وفقہی رائے کے سب کے لیے واجب الاحترام ہے۔ اسی طرح جن اہل علم وفتویٰ کی رائے اس کے برعکس ہو وہ بھی اسی احترام کی مستحق ہے۔ اگر کچھ لوگ اسے ایک متفقہ اور فیصلہ کن فتویٰ کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں تو ان کی بہت بڑی غلطی ہے۔ اس معنی میں تو یہ متفقہ فتویٰ ہو سکتا ہے کہ مخصوص اجلاس کے تمام شرکاء نے اس سے اتفاق کیا ہے، لیکن وہ اجلاس بذاتِ خود نمائندہ اجلاس نہیں کہلا سکتا جس میں کل پاکستان سے صرف ۳۱ علماء کے دستخط ہوں اور مثال کے طور پر پنجاب کے پینتیس اضلاع میں سے صرف چار کی نمائندگی ہو اور تقریباً اسی طرح کا حال باقی صوبوں کا ہو پھر اکتیس علماء میں سے درجن کے قریب حضرات کا تعلق صرف دو اداروں سے ہو، جن شہروں کی نمائندگی بھی ہے۔ ان میں متعدد ایسے شہر ہیں جہاں کے کئی نمایاں، عوامی مرجعیت اور علمی مقام رکھنے والے اہم ادارے اس میں شامل نہیں ہیں۔ کئی اداروں کی طرف منسوب شخصیات کے اگرچہ دستخط ہیں، لیکن یہ واضح نہیں ہے کہ ان متعلقہ اداروں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور وہاں کی دیگر شخصیات کی بھی یہی رائے ہے۔ اس لیے کہ ان میں متعدد ادارے ایسے ہیں جن کی متعدد شخصیات بلکہ ذمہ دار شخصیات الیکٹرانک میڈیا پر آتی رہتی ہیں۔ مطبوعہ فتویٰ کے عنوان میں ''طویل غور وخوض کے بعد'' کے لفظ ہیں۔ یہ بھی واضح نہیں کہ اس ''طویل غور وخوض'' میں دستخط کرنے والے سبھی حضرات شامل تھے۔ یا یہ ''طویل غور وخوض'' تو چند حضرات نے فرمایا اور باقیوں نے تصدیق فرمادی۔ ان گزارشات کا مقصد کسی پر اعتراض کرنا نہیں ہے، ہمیں حسنِ ظن ہے کہ اجلاس منعقد کرنے والے حضرات کا مقصد بھی اسے ''متفقہ فیصلہ'' کے طور پر متعارف کرنا نہیں ہوگا بلکہ ایک نقطۂ نظر رکھنے والوں کی آواز اور رائے کو یکجا کرنا ہوگا۔ ویسے بھی اگر متفقہ تو کیا اکثریتی رائے بھی نہ ہو بلکہ اقلیتی رائے ہو تب بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ اس لیے کہ فقہی اجتہادی مسائل میں قلت وکثرت کا اتنا زیادہ اعتبار نہیں ہوتا۔ اقلیتی رائے ہو یا اکثریتی اس سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے، بحیثیت رائے اس کا احترام بہرحال ضروری ہے۔ یہ ساری گزارش اس لیے کرنی پڑی کہ ہمارے ہاں بہت سطحی انداز سے کسی رائے کو ''متفقہ فیصلہ'' قرار دینے کی مثالیں پہلے سے موجود ہیں۔ کہیں یہ فتویٰ بھی شرکاء اجلاس کی بجائے تمام علماء کا ''متفقہ'' قرار نہ پائے۔

فقہی مسائل میں فتاویٰ اور آراء کا اختلاف کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ ہر دور میں ہوتا رہا ہے اور اگر یہ اختلاف حدود واعتدال میں ہو تو امت کے لیے باعثِ رحمت ہے۔ ایسے مسائل میں ہر دور میں فقہاء امت نے یہ خوبصورت منہج عمل تجویز فرمایا کہ جو صاحب علم خود رائے قائم کرنے کا اہل ہے وہ اس رائے پر عمل کرے جسے وہ دیانت داری سے راجح سمجھتا ہے اور جو خود رائے قائم کرنے کے اہل نہیں ہیں وہ اس صاحب علم کی رائے پر عمل کرنے والوں کو اعتراض اور تنقید کا نشانہ نہ بنائے، اسی کے ساتھ یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اس طرح کے مسائل میں ہر شخص کا فتویٰ اور رائے خود اس پر یا اس پر اعتماد کر کے اس کی رائے اختیار کرنے والوں پر لاگو ہوگا، دوسرے پر نہیں۔ لہٰذا میں اگر ایک کام کو اپنی دیانت دارانہ رائے میں ناجائز سمجھتا ہوں لیکن کوئی دوسرے صاحبِ علم شرعی دلائل کو سامنے رکھ کر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ کام جائز یا مستحسن ہے تو اس کام کا مرتکب ہونے کی صورت میں، میں تو گناہ گار ہوسکتا ہوں۔ مجھے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ میں دوسرے صاحبِ علم کو یا ان کی رائے پر اعتماد کر کے عمل کرنے والوں کو بھی گناہ گار قرار دوں۔ یہ اصول ویسے تو بہت سیدھا سا اور واضح ہے لیکن بعض مواقع پر دیکھنے میں آیا ہے کہ کچھ لوگ اس سے چیں بہ جبیں ہوتے ہیں، شاید انھیں دوسرے لوگ گناہ گار ہونے اور اس فتویٰ کی زد سے بچتے ہوئے نظر آتے ہیں تو ان کے خیال میں فتویٰ کا مزہ ہی کرکرا ہوجاتا ہے۔

یہ ساری تفصیل ان مسائل کے بارے میں جن میں مستند اہل علم کا واقعی شرعی دلائل کی بنیاد پر اختلاف ہو، مذکورہ شائع شدہ فتویٰ میں زیرِ بحث لائے گئے دونوں مسئلے بھی یقیناً اس نوعیت کے ہیں، اس لیے کہ پہلے مسئلے یعنی اسلامی بینکاری میں اگرچہ ان علماء کرام مدظلہم نے حرمت کی رائے اختیار کی ہے لیکن دوسری طرف بھی صرف پاکستان نہیں عالم اسلام کے جو بڑی تعداد میں علماء ہیں۔ ان کے بھی علم، تدین اور متعلقہ معاملات سے پوری واقفیت اور تجربے میں سے کسی چیز کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طرف ایسی انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی جس کی وجہ سے ان کی رائے اور فتویٰ کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔

اسلامی بینکنگ کا مسئلہ تو خیر گزشتہ چند دہائیوں کی پیداوار ہے اور ابھی ارتقائی مراحل سے گزر رہا ہے۔ تصویر کا مسئلہ تو قرونِ اولیٰ ہی سے مختلف فیہ چلا آ رہا ہے۔ مذکورہ فتویٰ میں اگر چہ یہ مؤقف اختیار کیا گیا ہے کہ جاندار کی تصویر کی ہر شکل ناجائز ہے، لیکن اس عموم کے ساتھ حرمت کے بہت کم فقہاء قائل ہوں گے، کیونکہ بیشتر فقہاء کے ہاں جان دار تصویر کے بنانے یا رکھنے میں متعدد استثناءات موجود ہیں، فقہاء کی ایک جماعت صرف اس تصویر کو حرام قرار دیتی ہے جس کا بت وغیرہ کی طرح مستقل وجود ہو۔ غیر سایہ دار تصویر یعنی جو دوسری چیز پر نقش ہو وہ ان کے نزدیک حرام نہیں ہے۔ صحابہ و تابعین میں بھی متعدد حضرات کا یہ مذہب ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ حضرات تصویر کے بارے میں بعض حدیثوں کے راوی بھی ہیں۔ البتہ فقہاء حنفیہ سمیت کئی فقہاء نے اس نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں کیا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ اختلاف عہدِ صحابہ و تابعین سے موجود ہے اور دونوں طرف دلائل موجود ہیں۔ پھر جو حضرات غیر سایہ دار تصویر کے ناجائز ہونے کے قائل تھے، ان میں کیمرے کی ایجاد کے بعد یہ نئی بحث شروع ہو گئی کہ کیمرے کے ذریعے حاصل کی جانے والی فوٹو ناجائز تصویر میں داخل ہے یا نہیں۔ اس لیے کہ کیمرے کے ذریعے فوٹو گرافی کا عمل بوجوہ ہاتھ سے تصویر سازی سے مختلف تھا۔ ظاہر ہے کہ اس نئے مسئلے کا حکم قدیم فقہاء کی تصریحات میں تو مل نہیں سکتا تھا۔ اس لیے علماء کو دلائل و اصولِ شریعت کی روشنی میں غور کرنا پڑا اور اس کے نتیجے میں دونوں آراء تصویر شرعی ہونے اور نہ ہونے کی سامنے آئیں۔ دونوں طرف آراء رکھنے والے جید اہل علم تھے اور دونوں نے اپنی اپنی رائے دلائل شرعیہ میں غور کے بعد ہی قائم کی۔ یہ تأثر کہ محض جدید آلہ ہونے کی وجہ سے ہی بعض اہل علم نے کیمرے کی تصویر کے جواز کا فتویٰ دے دیا، ان حضرات کے تفصیلی دلائل سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ ان کے پیش نظر بھی یہ بات تھی کہ فوٹو اپنی ماہیت کے اعتبار سے تصویر شرعی میں داخل ہے یا نہیں نیز تصویر سازی کی حرمت کی علّت بھی فقہاء کی استنباط کردہ نہیں بلکہ منصوص علّت اس میں پائی جاتی ہے یا نہیں۔ اس وقت مجھے نہ تو اپنا نقطۂ نظر بیان کرنا ہے اور نہ ہی دلائل کی تفصیل * پھر عام کیمرے کے بعد ویڈیو کیمرہ ایجاد ہوا تو اس وقت کے علماء میں پھر نئے زاویے سے یہ مسئلہ زیر بحث آیا جو کیمرے کی فوٹو کو تصویر شرعی میں داخل نہیں کرتے تھے۔ ان کے ہاں یہ نیا مسئلہ نہیں تھا۔ عام کیمرے کی فوٹو کو بحکم تصویر قرار دینے والوں کے ویڈیو کے بارے میں دونوں نقطۂ نظر سامنے آئے پھر نئے ڈیجیٹل نظام کے عام ہونے کے بعد بعض نئی بحثیں سامنے آئیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس مسئلے میں مختلف آراء صدیوں پر محیط علمی و فقہی بحثوں کی پیداوار ہے۔ ایسے میں کسی ایک رائے کو ''جدیدیت کی رَو میں بہہ جانے'' اور ''جدیدیت و اباحیت کی ناجائز پیروی'' سے تعبیر کرنا انتہائی بے جا بدگمانی ہے۔ جس کی زد میں نہ معلوم کون کون سے اہل علم و تقویٰ آ جائیں گے۔ مثلاً حضرت مولانا مفتی جمیل صاحب تھانویؒ سابق مفتی جامعہ اشرفیہ کی ٹی وی کے بارے میں رائے اہل علم میں کسی حد تک معروف ہے۔ اب تو متعدد جرائد نے آپ کے تفصیلی فتویٰ کو چھاپ بھی دیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

* جو اسے کسی قدر تفصیل سے دیکھنا چاہیں وہ اشرف التوضیح جلد ثالث، باب التصاویر ملاحظہ فرمائیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''مگر اس آلہ کے ہر استعمال کو حرام کہنا سخت بے احتیاطی اور کلیتًا اجتناب کو فرض کہنا زیادتی ہے۔ مختصر حکم اس کا یہی ہے کہ جو کام باہر حرام یا مکروہ تحریمی بلکہ کفر و شرک ہے وہ اس میں بھی حرام، مکروہ کفر و شرک رہیں گے اور جو کام باہر جائز تھے، وہ اس میں بھی جائز رہیں گے۔'' (ماہنامہ ''نورعلی نور''، شوال ۱۴۲۹ھ)

یہ اس مردِ درویش کی رائے ہے جس کے دل میں ٹی وی پر نظر آنے کی شاید کبھی خواہش بھی پیدا نہ ہوئی ہو، کیا میڈیا پر نظر آنے اور کیمروں کی بھرمار پر مشتمل اجتماعات میں شرکت فرمانے والے ہمارے یہ بزرگ اس مردِ درویش کی اس رائے کو بھی جدیدیت اور اباحیت ہی کا مظہر قرار دیں گے۔

ابھی چند دن پہلے چمن بلوچستان سے حضرت مولانا عبدالغنی مدظلہم کی سرپرستی میں شائع ہونے والا ماہنامہ (غالبًا الہدیٰ نام ہے) وصول ہوا۔ اس میں حضرت مولانا مفتی محمودؒ کا ایک خطاب شائع ہوا ہے جو انھوں نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے پہلے ریڈیو اور ٹی وی پر فرمایا تھا۔ مجھے معلوم نہیں حضرت مفتی محمودؒ کی رائے سے صرف اختلاف کیا جائے گا یا ان پر بھی جدیدیت اور اباحیت کی رَو میں بہہ جانے کا فتویٰ لاگو ہوگا۔

ایک اور بات اس ناکارہ کے چھوٹے سے دماغ اور ناقص فہم میں نہیں آرہی، وہ یہ کہ اس فتویٰ میں ٹی وی پر آنے والے یا اسے درست سمجھنے والے علماء کرام کو بھی مخاطب بنایا گیا ہے بلکہ شاید مرکزی مخاطب وہی ہیں۔ علماء کرام دو طرح کے ہیں، ایک وہ حضرات جو فقہی مسائل میں خود صاحب رائے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ دیگر حضرات کے فتویٰ کے پابند نہیں ہیں۔ دوسرے جو صاحب رائے نہیں ہیں۔ وہ بھی کم از کم اتنے شعور کے مالک تو ضرور ہوتے ہیں کہ یہ فیصلہ کر سکیں کہ کوئی کام کرنے سے پہلے کس سے مسئلہ پوچھنا ہے۔ ایسے میں اس فتویٰ کی اس وسیع پیمانے پر اشاعت کہ تقسیم بھی ہو اور ڈاک کے ذریعے مدرسے مدرسے تک پہنچایا جائے اور فتویٰ میں یہ الفاظ بھی ہوں: ''علماء کرام کا ٹی وی پر آنا اور اسے تبلیغ دین کی ضرورت کہنا اور سمجھنا شریعت کی خلاف ورزی ہے اور جدیدیت و اباحیت کی ناجائز پیروی ہے۔'' کیا اس کا یہ مطلب سمجھا جائے کہ چند حضرات علماء کرام مدظلہم نے یہ ذمہ داری بھی سنبھال لی ہے کہ وہ دیگر علماء و اہل فتویٰ و اہل رائے کو بتائیں کہ انھیں کیا ''کہنا'' اور ''سمجھنا'' چاہیے۔ اس سے ہٹ کر کسی نے کچھ ''کہا'' یا ''سمجھا'' تو وہ شریعت کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوں گے؟ خدا کرے کہ یہ ہماری فہم ہی کا نقص ہو اور ان حضرات کی مراد یہ نہ ہو۔

[مطبوعہ: ماہنامہ ''الصیانۃ'' لاہور، نومبر ۲۰۰۸ء]

© rasailojaraid.com